ڈاکٹر شائستہ حمید خان

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

ڈاکٹر ریحانہ کوثر

ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدرِ شعبہ اُردو، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور۔

محمد عمران

پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

انور سجاد کے افسانوں میں علامت نگاری

Dr. Shaista Hameed Khan
Assistant Professor, Department or Urdu, GC University, Lahore.
Dr. Rehana Kausar
Associate professor, Chairperson, Department of Urdu, Lahore Collage for Women University, Lahore.
Muhammad Imran
Ph. D Scholar, Department or Urdu, GC University, Lahore.

Symbolism in the Short Stories of Anwar Sajjad

Anwar Sajjad is an important name of Urdu short stories. He wrote romantic short stories using symbols and metaphors. But after some time this symbolic color was sharpest. He also tried to match the controversial signs from the symbols. He also tried to combine mythological stories with symbols. Through the sinners and symbols, themes of oppression, oppression, humiliation and themes like human and moral values have presented. In this article, the symbolism in fictions of the Anwar Sajjad is described.

Key Words: *Anwar Sajjad, Urdu, short stories, Romantic, Symbols, Metaphors.*

اُردو ادب میں افسانہ نگاری کی ابتدا بیسوی صدی کے آغاز سے ہوئی۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم ابتدائی افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئے۔ اُردو افسانے میں ۱۹۳۰ء تک اصلاحی اور رومانوی رجحانات نمایاں رہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد جب عالمی ادب میں نئی نئی تحریکوں نے جنم لیا تو اُردو ادب نے بھی اس کا اثر قبول کیا اور نئے افسانہ نگاروں نے ترقی پسند تحریک کی حقیقت نگاری کے رد عمل میں علامتی اور تجریدی اسلوب اپنانا شروع کر دیا۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے جب تحریر و تقریر پر پابندیاں لگا دیں تو افسانہ نگاروں نے علامتوں، استعاروں اور تجریدی اسلوب کو اختیار کر لیا اور اپنی تحریروں میں علامتی رنگ کو فروغ دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ اُردو ادب میں علامتی افسانہ کی ابتداء ۱۹۶۰ء کے بعد ہوئی بلکہ اس سے پہلے بھی بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں علامتی رنگ واضح نظر آتا ہے۔ جیسا کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے "سودائے سنگین" اور "چڑیا اور چڑے کی کہانی" اور پریم چند کے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "کفن" وغیرہ میں علامتی رنگ نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتی ہیں:

"علامتی اور تجریدی افسانہ گو 'آج' کی پیداوار معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا آغاز اتنا اچانک نہیں جتنا بعض اوقات قارئین کے ردِ عمل سے محسوس ہوتا ہے۔" (۱)

اس دور میں علامتی افسانہ متعارف تو ہو چکا تھا مگر ترقی پسند تحریک کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ علامتی افسانہ زیادہ پھل پھول نہ سکا۔ مختلف ناقدین اور قارئین نے علامتی افسانے کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اس پر کئی طرح کے اعتراضات بھی اٹھائے گئے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانوں کو دو قسم کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو یہ کہ اس سے ابلاغ نہیں ہوتا اور دوسرا یہ کہ اس سے کہانی پن ختم ہو چکا ہے۔ مگر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں انتظار حسین اور انور سجاد جیسے نمایاں افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھے جنھیں قارئین نے پسند کیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک یہ سفر تیزی سے جاری رہا۔ چنانچہ اب جو افسانے لکھے جا رہے ہیں ان میں علامتی رنگ اور تجریدی اسلوب کے بھی سبھی رنگ نظر آتے ہیں۔ علامتی افسانے نے قاری میں یہ شعور پیدا کر دیا ہے کہ وہ کسی شے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے بنیادی مقصد کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

انور سجاد کا افسانوی اسلوب روایتی تھا مگر پھر وہ آہستہ آہستہ مغربی ادبیات سے متاثر ہوئے اور ایک علامتی افسانہ نگار کے روپ میں سامنے آئے۔ عام طور پر ان کے افسانوں کا موضوع جبر و استحصال رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں جبر و استحصال کی تمام تر طاقتوں کا رد علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہاب اشرفی اپنی کتاب "تاریخ ادب اُردو" میں لکھتے ہیں:

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June 2022)

"انور سجاد اپنی نوعیت کے ایک الگ طرح کے افسانہ نگار ہیں جن کا بیانیہ بھی اوروں سے مختلف ہے۔ اگر ان کا موضوع جبر و استحصال ہے تو اس کے لیے ان کی علامتیں اور استعارے نئے مزاج کے ہیں۔" (۲)

انور سجاد کے "چوراہا"، "تلاشِ وجود" اور "استعارے" نمایاں علامتی مجموعے ہیں جبکہ علامتی طرز کے افسانوں میں "چھٹی کا دن"، "آج"، "کنگر مین"، "پتھر لہو کہاں"، "گائے"، "کونپل"، "سنڈریلا"، "پرندے کی کہانی"، "کیکر"، "کارڈ یک دمہ"، "کینسر" اور "سازشی" وغیرہ شامل ہیں۔ اُن کے علامتی افسانے معاشرے کے مختلف حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر فوریہ اسلم لکھتی ہیں:

"اُن کے افسانوں میں علامت سازی کی اعلیٰ ہنر کاری کے ساتھ ساتھ شعور کی رو اور سریلسٹک (Surrealistic) انداز نمایاں ہے۔" (۳)

انور سجاد کے ہاں کرداروں کی نوعیت تین قسم کی ہے۔ پہلی قسم کا کردار ایک محدود طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ طبقہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن حالات کو سمجھ نہیں پاتا۔ دوسری قسم کے کردار سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں اور تیسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو زندگی کا گہرا شعور رکھنے کے باوجود اس کو نارمل انداز میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فردوس انور قاضی:

"اس قسم کے کرداروں میں قوت ہوتی ہے جو زندگی میں معنویت پیدا کر دے اور مغرور ذہنوں کو انسانی زندگی سے ابھرنے والی موسیقی کا شعور بخش سکے۔" (۴)

انور سجاد کے زیادہ تر کردار بے نام ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود علامتی کرداروں کو اس قدر موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ قاری افسانے میں پنہاں واقعے کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

"یہ بات قابل لحاظ ہے کہ انور کے کردار بے نام ہوتے ہیں اور انہیں ایسی صفات کے ذریعے مشخص کرتے ہیں جو انہیں کسی طبقے یا جگہ یا قوم سے زیادہ جسمانی یا ذہنی کیفیات کے ذریعے تقریباً دیومالائی فضا سے متعلق کر دیتے ہیں۔" (۵)

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June 2022)
ماخذ تحقیقی مجلہ

انور سجاد نے پرانے اور روایتی اسلوب کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے علامتی اسلوب کی بنیاد رکھی۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں منطقی قصوں اور علامتوں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ یہ علامتیں کبھی ''کیکر'' اور ''بنجر زمین'' کی صورت میں نظر آتی ہیں تو کبھی ''سنڈریلا'' کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

''انور سجاد نے پرانے اسلوب، زاویے اور فکر کے انہدام پر نئے وژن، نئے اسلوب اور بصارت کی علامتی بنیادیں رکھیں۔''(۶)

اُنھوں نے علامت سازی کے علاوہ اساطیر کا بھی استعمال کیا۔ استعاروں اور علامتوں کے ذریعے جبر، ظلم و ستم، ذات کا بنجر پن، انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی جیسے موضوعات نمایاں کیے۔ اُن کے مجموعے ''چوراہا'' میں جدید انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیتوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کہانیوں کے ذریعے سے اُنھوں نے انسانی بے بسی اور بے چارگی کی تصویر کشی کی ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

''اُنھوں نے 'چوراہا' کے افسانوں میں عہد کی جبریت اور گھٹن کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔''(۷)

انور سجاد نے انسان کی خارجی صورتِ حال کے ادراک اور انسانی مسائل کو سمجھنے کے لیے ''تلاشِ وجود'' کی بنیاد رکھی۔ اُنھوں نے داخلی کیفیات سے گزرتے ہوئے خارجی انتشار کو پہچانا اور پھر ان سب کو انتہائی احسن طریقے سے اپنے مجموعے ''چوراہا'' میں پیش کر دیا۔ اُن کا مرکزی مسئلہ وجود کی تلاش ہے مگر یہ وجود کون سا ہے؟ اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ یعنی عشق کے لیے اپنی پہچان یا کسی دوسرے وجود کی پہچان وغیرہ۔ انور سجاد وہ سماجی نقاد ہیں جو سماجی اور ثقافتی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

''انور سجاد ہماری ثقافتی زندگی کا وہ نمائندہ ہے جس نے قیامِ پاکستان کے بعد ایک نئی ثقافت کے خدوخال کو ابھرتے دیکھا اور اپنا تخلیقی سفر اسی فضا میں شروع کیا۔'' (۸)

بعض اوقات انور سجاد کے افسانوں میں استعمال کی گئی علامتیں اس قدر مبہم ہوتی ہیں کہ اسے سمجھنا قاری کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تائید میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں:

''انور سجاد کے افسانوں میں افسانویت کی بجائے فلسفہ طرازی کا شوق پایا جاتا ہے لیکن فلسفہ اور معمہ میں یہ فرق ہونا چاہیے کہ ان کو پڑھتے وقت یہ احساس تو ہوتا ہے کہ اس

میں شاید فلسفہ یا زندگی کا کوئی نیا نکتہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے... لیکن جن علامات کے ذریعے یہ کوشش کی ہے وہ انتہائی مبہم ہوتی ہے۔" (۹)

"سازشی" انور سجاد کے مجموعے "استعارے" کا پہلا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے آپ کو "ہم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زمانہ قدیم کے غلاموں کی طرح یا جدید زمانے کے جبری مزدوروں کی طرح نہر کھودنے میں لگے رہتے ہیں۔ "سازشی" کے تین بنیادی کردار ہیں۔ ایک بوڑھا شخص، دوسرا نوجوان لڑکا اور تیسرا کردار بھالو ہے۔ یہ تمام لوگ قیدی ہیں جو کہ جبری مزدوروں کی طرح نہر کھودنے پر لگائے گئے ہیں۔ بوڑھا سب کو بتاتا ہے کہ اس کا تعلق موہنجوداڑو سے ہے اور وہاں کی مشہور رقاصہ اس کی بیوی تھی۔ لیکن جب وہ لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اب ہر شے ختم ہو چکی ہے تو نوجوان اسے برا بھلا کہتا ہے کہ ہر شے معدوم نہیں ہو سکتی۔ افسانے میں نوجوان کہتا ہے:

"جھوٹے، تم سب جھوٹے ہو، ہم سب کھوئے ہوئے اور یہ سارا عمل بے معنی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ہم یہ نہر اپنے لیے کھود رہے ہیں کہ یہ سراب ہے۔ یہ نہر ہم اپنے لیے نہیں کھود رہے ہیں نہ اس سے ہماری زندگی ہمارے لیے اُگے گی۔" (۱۰)

افسانے میں بوڑھا شخص علامتی رنگ پیش کر رہا ہے کیونکہ وہ قیدیوں کو گمراہ کر رہا ہے کہ اب ہر شے معدوم ہو چکی ہے گویا کہ وہ لوگوں کی ہمت اور حوصلہ پست کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور انہیں خاموش رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف خاموشی میں بھی ایک سازش چھپی ہوئی ہے کیونکہ جب تک قیدی خاموش رہیں گے کسی بھی چیز کی حقیقت کھل نہ سکے گی۔

افسانے میں نوجوان لڑکے کا کردار بھی علامتی طرز کا ہے جو کہ فوجیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتا ہے۔ نوجوان لڑکا بوڑھے شخص اور رقاصہ کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے آپ کو قیدی تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ ہم سب کھو چکے ہیں۔ فوجی اس کو رائفل سے زخمی کرتے ہیں۔ اس کی زبان اور منہ سے لہو بہنے لگتا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیلنے اور سکڑنے لگتی ہیں۔ نوعمر نوجوان کی یہ حالت دیکھ کر رائفل والے ہنستے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انور سجاد نے انسانی بے حسی اور بربریت کو انتہائی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے میں نہر سے دریاؤں کا لبالب بھر جانا ہر شخص کو آزادی کی نوید سناتا ہے۔

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June 2022)
ماخذ تحقیقی مجلہ

"کارڈیئک دمہ" بھی ایک علامتی افسانہ ہے جس میں انور سجاد نے مختلف چیزوں کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ پرندے، کالی مٹی کے ذرات وغیرہ۔ کالی مٹی کے ذرات ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ذرات علامتی کردار کے پھیپھڑوں میں جم رہے ہیں۔ جس وجہ سے اس کا سانس پھول رہا ہے۔ پھیپھڑے لہو کو آکسیجن مہیا کرنے سے قاصر ہو رہے ہیں مگر وہ ان سب کی پرواہ کیے بغیر بازاروں گلیوں میں سے گزرتا ہوا پنڈال تک پہنچتا ہے۔ لوگ اسے سننے کے لیے کھڑے ہیں وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے مگر لفظ ہیں کہ حلق میں آ کر پھول جاتے ہیں پھیپھڑے لہو کو آکسیجن مہیا کرنے کی بجائے اس میں مٹی کے ذرات کھول رہے ہیں۔ گویا کہ مٹی کے کالے ذرات ایک بیرونی سازش کے طور پر نمودار ہو رہے ہیں جو اس کی ہمت توڑ رہے ہیں اور اسے کچھ بھی کہنے سے روکا جا رہا ہے۔

"پرندہ" علامتی طور پر آزادی کی نمائندگی کرتا ہے مگر گرد آلود فضا میں علامتی کردار کی طرح پرندے بھی سانس لینے کی آزادی کھو چکے ہیں۔ یعنی اس گرد زدہ فضا نے نا صرف انسانوں کی بلکہ پرندوں کی آزادی کو بھی چھین لیا ہے۔ مہدی جعفر رسالہ "شب خون" میں لکھتے ہیں:

> "افسانے میں گرد کا علامتی سلوک آہستہ آہستہ بڑھتا ہے وہ پیغام دینا چاہتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں موجود سرخ سرخ دھبوں کو زبان چاہیے زبان کے لیے آواز چاہیے اور آواز پر گرد آور دھوئیں کا پہرہ تھا۔" (۱۱)

گویا کہ گرد جبر و ظلم کی علامت ہے۔ آخر میں افسانے میں جبر و ظلم اپنی انتہا پر پہنچتا ہے جب علامتی کردار زنا بالجبر کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اب اس کے لیے سانس لینا محال ہے۔ کوشش کے باوجود، روشنی کی موجودگی کے باوجود، گرد کے عالم میں سانس لینا محال ہے۔

"واپسی، دیوجانس، روانگی" علامتی طرز کا افسانہ ہے جس میں ایک پرندہ جس کی ٹانگ اور ایک پر ٹوٹا ہوا ہے۔ ایک شخص جس کی دائیں ٹانگ بالکل سوکھ چکی ہے اور وہ بیساکھی کا محتاج ہے۔ جبکہ شیشم کا ایک درخت ہے جس پر موجود بہت سے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ انور سجاد نے اس افسانے میں پرندے اور شخص کو علامت بنا کر زندہ لوگوں کی مجبوریاں بیان کی ہیں۔ پرندہ جس کا پر ٹوٹا ہوا ہے وہ اُڑنے سے محروم ہے جبکہ سوکھی ٹانگ والا شخص چلنے

سے محروم ہے۔ پرندے کو درخت پر موجود دوسرے پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دے رہی ہے اور وہ ان سے جا ملنے کی کوشش میں اپنا ٹوٹا ہوا پر اٹھا کر اڑنے کی جستجو کرتا ہے مگر ہر بار زمین پر آن گرتا ہے۔

بالآخر مسلسل کوشش کے بعد پرندہ ایک اڑان بھر کر درخت کی شاخ پر پہنچ جاتا ہے۔ اپاہج شخص شہر سے دور بیٹھا لوگوں کا شور سن رہا ہے۔ وہ ایک نوجوان پر پولیس کی لاٹھیوں اور بندوقوں کے بٹ چلتے دیکھ رہا تھا۔ نوجوان پتھروں سے لاٹھیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اپاہج شخص اپنی بے بسی پر افسوس کر رہا تھا پھر اچانک اس نے اپنی بیساکھی نوجوان کی طرف اچھال دی اور ایک لطیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی کہ جیسے بیساکھی نہیں بلکہ خود وہ نوجوان کے ساتھ ہے۔ گویا کہ انور سجاد سماجی انسان کو کسی بھی حالت میں بیکار نہیں سمجھتے۔ افسانے میں ایک اپاہج زخمی پرندے کی تقلید میں اپنی بیساکھی استعمال کرتے ہوئے سماجی عمل میں شامل ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ انور سجاد اپنی نوعیت کے ایک الگ طرح کے افسانہ نگار تھے۔ اُن کا بیانیہ دوسرے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف تھا۔ اُنھوں نے علامتیں اور استعارے استعمال کرتے ہوئے معاشرے میں موجود جبر، ظلم و ستم، داخلی شکست، گھٹن اور انسانی و اخلاقی قدروں کی پامالی جیسے موضوعات کو نمایاں کیا اور اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے معاشرے کی زبوں حالی، پریشانی، بیماری اور بے بسی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔

حوالہ جات

۱۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص:۳۸۸۔

۲۔ وہاب اشرفی، تاریخ ادب اُردو (جلد سوم)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص:۱۲۷۴۔

۳۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ص:۴۰۹۔

۴۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۹۹ء، ص:۵۲۹۔

۵۔ نوازش علی، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال (مرتبہ)، راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، ۲۰۰۵ء، ص:۲۶۷۔

۶۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ص:۴۱۱۔

۷۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ص:۴۱۲۔

۸۔ سہیل احمد خان، مجموعہ سہیل احمد خان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص: ۳۲۹۔

۹۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، ص: ۵۲۵۔

۱۰۔ انور سجاد، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد، (افسانہ سازشی)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۵۵۔

۱۱۔ مہدی جعفر، "انور سجاد کی امیجری اور میری ہوا خوری"، مشمولہ: شب خون، الہ آباد: بھار گو پریس، شمارہ نمبر: ۲۳۱، ۱۹۹۹ء، ص: ۳۸۔